Date of Publication: 09-08-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 August 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 August 2013 — ۱۵ تا ۲۱ اگست ۲۰۱۳ء

Issue: 31, Vol.: 72 — شمارہ نمبر: ۳۱، جلد نمبر: ۷۲

اردو کے ممتاز محقق اور حقی نقاد رشید حسن خاں صاحب کا یہ مضمون ان کی کتاب 'تلاش و تعبیر' میں شامل ہے، چوں کہ اس مضمون کی اہمیت و افادیت آج بھی برقرار ہے، اس لیے، اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

زبان و بیان کے بعض پہلو

(پہلی قسط)

رشید حسن خاں

شاعری کی دنیا میں ایک دور ایسا گزر چکا ہے جب لفظوں کے رکھ رکھاؤ، مناسبات کے التزام اور انداز بیان کے پیچ و خم کو شاعرانہ کمال کے اظہار کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ صرف بندش الفاظ اور محض مرصع سازی مقصود بھی تھی اور معیار بھی۔ اُس صنعت گری کے زمانے میں جتنی بدعتیں پھیلیں اور شاعری کو جس قدر نقصان پہنچا، اُس سے ہم سب واقف ہیں۔ رعایت لفظی کے پھیر میں اس طرح گرفتار ہو جانے سے اشعار کاغذی پھول بن کر رہ گئے تھے۔

ادھر ۲۰، ۱۵ برسوں میں ناقدین نے ہیئت کے تجربوں، ادب و سماج کے مخصوص خیالات کی نشر و اشاعت کا وسیلہ بنا لیا گیا تھا۔ تنقید حیات، حقیقت نگاری اور سماجی بصیرت کے کچھ مفروضات کی ترجمانی شاعروں کا فرض تھا، اس سے غرض نہیں تھی کہ کس بات کو کس طرح کہا جائے۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ جو ترقی پسند ہے وہ اچھا شاعر بھی ہے اور جو اس بزم میں باریاب نہیں، وہ کچھ نہیں۔ زندگی اور اُس کے مظاہر کو جو دنیا کی لامحدود وسعت کی طرح مختلف النوع ہیں ایک خاص آئیڈیالوجی کے دائرے میں بند کر کے، شاعری کو اُس محدود تصورِ حیات کی آئینہ داری کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ شاعری کا مقصود اگر یہ ہو کہ اُس باہمی تعلق اور اس کے تجزیے پر اس حد تک زور دیا کہ حسن بیان، فصاحت کلام اور معانی و بیان کے بے حد ضروری قاعدوں کو نظر انداز کر دینا 'باشعور شاعر' کے لیے ضروری سا ہو کر رہ گیا۔ اس طرح پھر ایک بار وہ تناسب و توازن ختم ہو گیا جس کے بغیر نہ خیال و اظہار میں ربط کامل پیدا ہو سکتا ہے، نہ حسنِ بیان اور تاثیر کی دولت ہاتھ آ سکتی ہے۔ قدیم شاعروں کے ایک گروہ نے الفاظ کو سب کچھ سمجھ کر، انھی کی گردان کو معراج سمجھ لیا تھا؛ بہت سے نئے شاعروں نے صرف ہیئت کے کچھ تجربوں اور مواد کی ماہیت کو سب کچھ فرض کر کے، شاعری کو حسن بیان اور تاثیر سے معرا بنانے کی کامیاب کوشش کی اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ صرف لفظ پرستی یا محض خیال آرائی کا نام اچھی شاعری نہیں ہو سکتا۔

ہمارے زمانے کے شاعروں کو زبان و بیان سے اس حد تک بے نیاز بنانے میں اس بات کو بھی بہت دخل تھا کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شاعری کو کچھ کا سہارا لے کر بعض سیاسی نظریات کی تبلیغ کی جائے اور اس ہنگامے میں فن، اسلوب، معانی و بیان اور لطافت و فصاحت کا تذکرہ فضول سی بات ہو کر رہ جائے، تو تعجب کی کیا بات ہے!

فن اور اُس کے ضابطے کاوش کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اچھی شاعری کے لیے مشق، مطالعہ اور فکر و تامل کی اہمیت کا احساس بنیادی شرط ہے۔ اگر شاعری کا بلند ترین معیار پیش نظر ہو تو یہ سارے مراحل طے کرنا ہی پڑیں گے؛ لیکن اگر شاعری و صحافت میں امتیاز نہ کیا جائے اور شاعر کا وہی کام ہو جو کسی جماعت کے پروپیگنڈا سکریٹری کا ہوتا ہے، اُس صورت میں کسی سر و سامان کی ضرورت نہیں۔ برسوں یہ کاروبار چلتا رہا کہ شاعر ہر ضروری چیز سے بے نیاز ہو کر صرف مجاہدوں کی فہرست میں نام لکھا کر یہ فرض کر لیتے تھے کہ بس سارے مرحلے طے ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ شعر شاعر کے ذہن پر مع الفاظ نازل ہوا کرتا ہے۔ یہ خوش فہمی اس حد تک بڑھی کہ کوئی حد ہی نہیں رہی۔ شاعروں نے یہ سمجھ لیا کہ ٹوٹے پھوٹے لفظ، بے جوڑ تعبیرات اور مبہم طرزِ بیان؛ یہ ساری 'نعمتیں' عطیۂ فطرت ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ایک لفظ کو پرکھنے، مرادفات کے نازک مفاہیم کو ملحوظ رکھنے اور بہ لحاظ انداز بیان خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہنے سے نجات حاصل کرنے کا یہ کامیاب نسخہ تھا۔ ان حضرات نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ قدما کے بہت سے نہایت اچھے شعر، جن پر آج ہم وجد کرتے ہیں، انھی الفاظ میں اُن کے ذہن پر نازل نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے مسودے سامنے ہوں تو معلوم ہو کہ ایک ایک لفظ پر کتنی بار خطِ تنسیخ کھینچا گیا ہے اور ایک ایک مصرعے کو کس کس رخ سے کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاگردوں کے کلام پر استادوں کی اصلاحوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ باکمال استاد نے صرف ایک لفظ کو بدل دیا ہے یا اُس کو ادھر اُدھر کر دیا ہے اور شعر کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ ہر شاعر کے یہاں کچھ ہم معنی اشعار ہوتے ہیں، کسی کے یہاں کم کسی کے یہاں زیادہ؛ کچھ شعر ایسے ہوتے ہیں کہ نفسِ مفہوم ایک ہے، صرف انداز بیان کے معمولی سے فرق نے دونوں شعروں میں اندھیرے اُجالے کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ قدیم شاعروں میں سے میر کے یہاں اور اس زمانے میں فراق کے یہاں اس کی مثالیں بہ کثرت ملیں گی۔ مختلف شاعروں کے یہاں ہم معنی شعر ملتے ہیں۔ نفسِ مفہوم ایک ہے، لیکن طرزِ بیان کی خوبی و خامی یا انتخاب الفاظ کے فرق نے ایک شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ مشقِ سخن بڑی چیز ہے جس سے قدرتِ بیان کی قابلِ رشک صلاحیت نمایاں ہو جاتی ہے، اور اُس منزل پر پہنچ کر کبھی کبھی شعر واقعی مع الفاظ ذہن پر نازل ہوا کرتے ہیں، لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ اچھے اچھے مشاق شاعروں کو ایک مناسب لفظ کے انتخاب میں یا مناسب اسلوب بیان کی تلاش میں دنوں پریشان ہوتے دیکھا گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ایک مدت کی مشق، قدیم ادب کے اچھے مطالعے اور فکر و تامل کی بہت سی دشوار منزلیں طے کرنے کے بعد یہ مرتبۂ بلند ملتا ہے۔ بہت سے نئے شاعروں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ سارے مرحلے خود بہ خود طے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اہلِ نظر اور کج روی کا امتیاز ہی ختم کر دیا۔ اس مفروضے نے بھی زبان و بیان کو خاصا نقصان پہنچایا۔

ہمارے بہت سے شاعر انتخاب الفاظ میں سلیقے سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ بہ غور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض اچھی خاصی نظمیں محض اس لیے بے اثری کا شکار ہو جاتی ہیں کہ چند لفظ یا چند تعبیریں غیر مناسب یا نامانوس ہوتی ہیں۔ اُن چند لفظوں کا کفارہ پوری نظم کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ مندرجہ ذیل صورتوں میں صحتِ بیان اور حسنِ بیان کے نقطۂ نظر سے خامیاں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں:

(1) مناسب صفاتی الفاظ کا نہ ہونا

(۲) غلط استعارے

(۳) مرادف الفاظ میں سے صحیح لفظ کا انتخاب نہ کرنا

(۴) فصاحتِ کلام کے لحاظ سے غیر مناسب الفاظ کو منتخب کرنا

ہمارے بعض شاعروں نے جدید الخیم یا جس نسبت عاری ایسے استعارے تراشے ہیں کہ مذاقِ سلیم کے ساتھ ساتھ قوتِ فہم بھی الاماں پکار اٹھتی ہے۔ ہمارے یہاں انگریزی کے بعض اسالیب بیان کی کورانہ تقلید نے کئی وبائیں پھیلائی ہیں، غیر مناسب استعارے بھی اس کورانہ تقلید یا محض ترجمہ کر دینے کے شوق کا مآل بد ہیں۔

انگریزی میں Transfered Epithet ایک قاعدہ ہے، جس کا لفظی ترجمہ 'صفتِ منتقلہ' کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک موصوف کی صفت بہ نظرِ اختصار دوسرے موصوف کی طرف منتقل کر دی جائے اور اس موصوف کو حذف کر دیا جائے۔ اس اسلوب کو بے دریغ استعمال کیا گیا، یہ سوچے بغیر کہ اردو میں یہ تقلید محض مناسب بھی ہے۔ اردو یا فارسی میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں جس میں انتقالِ صفت اس طرح ہو، البتہ یہ کام استعارے سے لیا جاتا ہے۔ استعارے میں طرفین (مستعار لہ اور مستعار منہ) میں ایک تعلق کا ہونا ضروری ہے، جس کو 'وجہِ جامع' کہتے ہیں۔ 'وجہِ جامع' سے مراد وہ تشبیہی مناسبت ہے، جس کے واسطے سے ایک فرد یا چیز کی مخصوص صفت کو دوسرے فرد یا شے کی عین ذات مان لیا جاتا ہے۔ اگر جانبین میں کسی طرح کا تشبیہی علاقہ نہ ہو تو استعارہ کسی اعتبار سے صحیح نہیں ہو سکتا، جب کہ 'صفتِ منتقلہ' میں کسی ایسے واسطے کا وجود ضروری نہیں۔ یہ قاعدہ مناسب تصرف کے بغیر اردو سے میل نہیں کھا سکتا۔ جب اس میں تصرف کیا جائے گا، یعنی دونوں اجزا میں کسی نسبت کا علاقہ پیدا کیا جائے گا، اُس صورت میں یہ استعارے میں بدل جائے گا اور یہی اس کا صحیح مصرف ہے۔

ہر زبان میں کچھ خاص اسالیبِ بیان ہوتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ ان کو دوسری زبان میں اسی طرح منتقل کیا جا سکے۔ عام طور پر ہر زبان ضروری اور مناسب تصرفات کے ساتھ دوسری زبانوں کے اجزا کو قبول کرتی ہے، یہ مسلّمہ اصول ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ کسی زبان کے خاص اسالیبِ بیان کو دوسری زبان میں بجنسہٖ نقل کر دینا غیر مناسب بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اسالیب میں اتنا تصرف ضرور کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے گی کہ وہ اُس زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جائیں کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ جو طریقۂ اظہار ایک زبان میں درست ہو، وہ دوسری زبان میں بھی اُسی طرح قابلِ قبول ہو۔

میں اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ذیل میں تشبیہ، استعارے اور صفتِ منتقلہ کے نامناسب استعمال کی کچھ مثالیں درج کرتا ہوں۔ ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غیر مانوس اندازِ بیان کو کس کس طرح اپنایا گیا ہے:

مرے تصور کے زخم خوردہ افق سے
یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں
(سردار جعفری)

افق کو زخم خوردہ کہنا غلط ہے، یعنی افق کو طائر یا انسان فرض کیا جائے، اس طرح وہ زخمی ہو، پھر اُس کو افق کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کو تناسبِ بیان سے کوئی علاقہ نہیں، یہاں کوئی وجہِ شبہ مشترک نہیں۔

جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں
——— اٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں
(سردار جعفری)

پہلے زمین کو لے پالک بنا کر گود لیا، پھر اُس کو سبزہ بنا کر لہلہایا اور اُس سبزے کو بوسوں سے جگمگا دیا۔ یہ ساری باتیں لاطائل ہیں۔ پیشانی اور سبزے میں کوئی نسبت نہیں۔ نیز جب تک بوسے کے ساتھ کوئی ایسا لفظ نہ لایا جائے جس سے تابانی کا مفہوم نکلے، اُس وقت تک بوسوں کی جگمگاہٹ بھی فریبِ خیال کی حد سے آگے نہیں بڑھے گی۔

یہ خون جو تخلیق خوردہ جیبوں کی تھیلیوں
میں کھنک رہا ہے
(سردار جعفری)

خون کا استعارہ سکوں سے کیا گیا ہے، لیکن دونوں میں کوئی علاقہ نہیں۔ اس میں کئی محذوفات ہیں۔ کسان کا خون گرم فصل میں صرف ہوتا ہے، لیکن وہ فصل ڈیوڑھے سوائے کے پھیر میں آ کر بنیے کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ بنیا اُس مال قیمت سے سکے حاصل کرتا ہے، اس طرح کسان کا خون گرم تھیلی میں کھنکتا ہے۔ اگر استعارہ اسی کا نام ہے، تو پھر ایسے اشعار کو کیوں بُرا کہا جائے:

دعا کروں گا حشر میں موسیٰ پہ خون کا
کیوں اس نے آب دی مرے قاتل کی تیغ کو
جس طرح خونِ گرم نے کی پیچ
کھانے کے بعد سکوں کا بھیس بدلا ہے،

اسی طرح اس شعر میں کئی پھیر ہیں۔ جنابِ کلیم خدا سے دیدار طلب ہوئے، جس کے نتیجے میں برقِ حسن نے طور کو پھونک کر سرمہ بنا دیا۔ آنکھیں چلتی ہوئی تلوار تو ہوتی ہی ہیں، اس اعتبار سے اُس سرمے نے تیغِ چشم کو آب عطا کی۔ اس کے بعد محبوب کے قاتل بننے میں کیا کسر رہتی، اُس نے اُس مانگے کی تلوار سے غریب عاشق کو قتل کر دیا۔ عاشق حشر میں حضرت موسیٰ پر دعویٰ دائر کرے گا، کیوں کہ حربۂ قتل انھی کے واسطے سے فراہم ہوا تھا:

ٹھہرو کہ پانی کی آنکھ اشکوں سے تر نہ ہوگی
(سردار جعفری)

پانی کو آنکھیں عطا کرنا اور پھر یہ دعا کرنا کہ ان میں آنسو بھی نہیں آئیں گے، تکرار کے سوا کچھ نہیں۔

اور یوپان کی آزاد حسیناؤں نے
کتنے دل فصلِ بہاراں کے لیے بوئے ہیں
خاک پر مانے اُگائے ہیں وہ شعلے جن میں
مسکرانے کے لیے ہیں بے تاب
چاند تاروں کے کنول، فصلِ بہاروں کے گلاب
(سردار جعفری)

شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ اشتراکیت کی بہار لانے کے لیے یوپان کی بے شمار عورتیں قربان ہو گئیں، لیکن دل اور بیج میں ایسا کوئی علاقہ نہیں جس سے یہ مفہوم ادا ہو سکے۔ یہی حال شعلے اگانے کا ہے۔ ان شعلوں میں چاند تاروں کے کنول اور فصلِ بہاراں کے گلابوں کا مسکرانا مزید برآں! کئی شاعروں نے بونے اور اگانے کی ایسی مٹی عزیز کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہر چیز بوئی جا سکتی ہے، اسی طرح ہر چیز اگائی جا سکتی ہے، خواہ مذاقِ سلیم، فصاحتِ کلام اور حسنِ بیان دم توڑ دے۔ حد یہ ہے کہ ایک صاحب نے 'لہو بوتے' سے دریغ نہیں کیا ہے، فرماتے ہیں:

بطنِ گیتی سے اُبھرتی ہیں تجلّی کا ہیں
جب شفق وسعتِ مشرق میں لہو بوتی ہے
(احمد ندیم قاسمی)

بونے اور اگانے کی چند مزید مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں، ان کو پڑھ کر عبرت حاصل کی جا سکتی ہے:

(۱) اگرچہ رات مسلسل سیاہی بوتی ہے
(سلیمان اریب)

(۲) بطونِ خاک میں بوتے ہوئے سایۂ ہم
(سلیمان اریب)

(۳) چرواہے بنسی کی دھن سے گیت فضا میں بوئیں گے (ساحر لدھیانوی)

(۴) کہ دور دور کے کھلوں میں قحط بو جائیں
(ساحر لدھیانوی)

(۵) آگ رہی ہے بغاوتوں کی سپاہ
(سردار جعفری)

(۶) چٹانوں کے سینے سے سرما ہاتھ لگتے ہیں
(سردار جعفری)

(۷) دل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
(مجروح)

(۸) یہ پھول بھی تو اسی دھول سے اگے ہیں ندیم
(ندیم قاسمی)

(شاعر کی یہ جدت قابلِ داد ہے کہ اُس نے دھول سے پھول اگائے ہیں)

(۹) سولیاں اُگتی رہیں زندوں اُبھرتے ہی رہے

———

ہمارے ہر قحطی ہری دورِ بقان جو بغاوت کی سرزمیں پر
حسین ساولوں جو بن خرمن کی سرخ فصلیں اگائے ہیں
(سردار جعفری)

———

اس وحشت کے سائے میں کھلتے ہیں دل اُگتی ہے جوانی
اب نہ اگائے گی کوئی یہ دھرتی جنگ کے مہرے سانپ نہ بیلے
(مجروح)

———

شاعر کی آواز کو کس کا
خونیں پنجہ گھونٹ رہا ہے
(سردار جعفری)

آواز کا گھونٹنا محض یاد ہیچائی ہے۔ جب تک آواز کے ساتھ کوئی مناسب لفظ نہیں لایا جائے گا، اُس وقت تک بات نہیں بنے گی۔

مخمل سی ملائم راہوں پر
بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں
(ساحر)

راستے کو مخمل کی طرح ملائم بتانا اصولِ تشبیہ اور مذاقِ سلیم، دونوں کے ساتھ تمسخر کرنا ہے۔ 'ملائم راہیں' مزید برآں۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو راہیں مخمل کی طرح ملائم تھیں، ان پر فوجی بوٹوں سے صرف خراشیں پڑی ہیں!!

اپنے گوندھے ہوئے غم کے بدھن
شب کے سناٹے میں
جاگ اٹھتے ہیں تڑپ جاتے ہیں جلاتے ہیں
(مخدوم محی الدین)

غم کے بدھنوں کو گوندھنا ہی کیا کم تھا، کہ اُن کو استعارے کے پھیر میں لا کر آدمی بنا دیا اور اس طرح جاگ اٹھنے، تڑپ جانے اور جلانے کا فرض ان سے ادا کرایا گیا۔ مسرت و غم دونوں کو ذی روح کی صفات سے موصوف کیا جا سکتا ہے، کیا بھی گیا ہے، لیکن ہر گنجِ مکانے دارد! غم کے بدھن نہ تڑپیں گے نہ چلائیں گے۔

ابھی بانہوں کے حلقوں میں لچکتی ہوں گی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ردائیں اب تک
(ساحر)

مہکے مہکے ہوئے (مہکتے ہوئے کے بجائے) بالوں کی ردائیں بنائی گئیں، پھر ان رداؤں کو ذی روح بنا کر باہوں کے حلقے میں لچکنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ استعارہ در استعارہ نا پختگی ذہن و فکر کا غماز ہے۔

لدے ہے ہیں قدم جھنجلاؤں میں آج ابرِ بہار بن کر
(جاں نثار اختر)

قدموں کو ابرِ بہار سے تشبیہ دینا، حسنِ خیال کا خون کرتا ہے۔

آجاؤ میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
(فیض)

'غم کی چھال' بجائے خود غلط نہیں، لیکن اس کے لیے آنکھوں کو درخت بنانا کہاں کی خوش مذاقی ہے!

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
(فیض)

لالی کا لپکنا وہی استعارے کا ناجائز صرف ہے۔

جس میٹھے نور
اور کڑوی آگ سے
ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
(فیض)

میٹھا نور اور کڑوی آگ صفتِ منتقلہ کا کرشمہ ہے اور گلشن پھوٹنا مذاقِ سلیم سے قطع تعلق کر لینے کا نتیجہ ہے۔

تشبیہ و استعارے کی حیثیت دو دھاری تلوار کی ہے۔ یہ وہ عمل ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے خود عامل پر لوٹ پڑتا ہے۔ قدیم شاعروں اور استادوں نے بھی جہاں جہاں خوش مذاقی کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، وہاں نہایت مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے، مثلاً:

نوکِ مژہ پہ اشک جماعت نظام ہے
سوئے پہ آہوں کے چاندی کی شام ہے

صندل اس کی ہے مانگ میں کیا خوب
راہِ ظلمات میں یہ دلدل ہے

ساری رگیں ہوئی ہیں تپ تار پر نمود
لاغری نے جسم کو ستار بنا دیا

دیکھیے اس پیتاں پہ دلنوں کو تو چپ بھی کیسے
دودھ پینے کے لیے بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

ان اشعار میں بہ لحاظِ قواعد کوئی عیب نہیں، لیکن بد مذاقی نے سو عیب پیدا کر دیے

(بقیہ صفحہ ۔ پر)

مملکتِ غزل کی دلکش آواز مجروح سلطانپوری

ڈاکٹر مسعود جعفری (8-1-43/1/A/5، پوسٹ آفس شیخ پیٹ، حیدرآباد - 500 008)

ترقی پسند تحریک کے ساتھ غزل گو شاعروں میں فراق گورکھپوری کے ساتھ مجروح سلطانپوری نے کلاسیکی اور نئی غزل کو لوچ اور نرم نرم آنچ دینے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ انھوں نے غزل کو گھن لگنے سے محفوظ رکھا۔ زبان کے رکھ رکھاؤ کا پاس ان کی سوچ میں گھل گیا۔ روایتوں کو برقرار رکھتے ہوئے شعروں میں نیا پن پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ غزل کا بانکپن اور نکھار زندہ و پائندہ کیونکہ رزم کے ولولوں اور نعروں میں غزل گم گشتہ صنفِ سخن بنی جا رہی تھی۔ نامور شعرا نظم کو ترجیح دے رہے تھے۔ مشہور نقاد کلیم الدین احمد نے غزل پر نیم وحشی ہونے کا الزام لگایا۔ سردار، کیفی وغیرہ نظم کے ذریعے اپنے افکارِ تازہ کی آئینہ داری کر رہے تھے۔ وہ گاہے بگاہے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے غزل سے چھیڑ چھاڑ کرلیا کرتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ غزل کا کوئی مستقبل نہیں ہے، لیکن مجروح ایک پہاڑی چٹان کی طرح اپنے موقف پر کھڑے رہے۔ ان کے پائے استقلال میں لغزش یا لرزش نہیں ہوئی۔ انھیں معاصرین کی لعن طعن اور بے جا نکتہ چینیوں کی پرواہ نہیں رہی۔ ان کے شعروں کی تراش خراش، بین السطور معنی کا رچاؤ، چاندنی میں نہائے ہوئے دھلے دھلے الفاظ براہِ راست دلوں میں اترتے چلے گئے۔ ان کی غزل جگر مرادآبادی کے طرزِ سخن کی توسیع ہے۔ لیکن ایک مقام پر جگر نے بھی غزل کہنے والوں پر جم کر چوٹ کی:

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

مجروح کی غزلیہ شاعری اپنا تخلیقی سفر جوش و خروش کے ساتھ طے کرتی رہی۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ کے مصداق انھوں نے کہیں بھی پڑاؤ نہیں ڈالا۔ ان کی پہلی اور آخری امنگ غزل رہی۔ مجروح کے ہاں مایوسی کے بادل منڈلاتے نظر نہیں آتے۔ ایک حوصلہ، ایک عزم شعروں میں موجزن رہتا ہے۔ ان کی فکر و نظر میں آسمان کی وسعتیں دبکی رہتی ہیں۔ قید و بند کی صعوبتوں میں بھی رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ ملاحظہ ہو ان کا مضبوط ارادہ و جادہ جس پر وہ چلنا چاہتے ہیں:

مجروح کی غزلیہ شاعری اپنا تخلیقی سفر جوش و خروش کے ساتھ طے کرتی رہی۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ کے مصداق انھوں نے کہیں بھی پڑاؤ نہیں ڈالا۔ ان کی پہلی اور آخری امنگ غزل رہی۔ مجروح کے ہاں مایوسی کے بادل منڈلاتے نظر نہیں آتے۔ ایک حوصلہ، ایک عزم شعروں میں موجزن رہتا ہے۔ ان کی فکر و نظر میں آسمان کی وسعتیں دبکی رہتی ہیں۔ قید و بند کی صعوبتوں میں بھی رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

مجروح نے ان اشعار میں امید و یقین کی جوت جلائی ہے۔ وہ حیات و کائنات کی تابناکیوں کے زمزمہ خواں ہیں۔ وہ مطرب کی طرح چنگ و رباب پر نغمے بکھیرتے رہتے ہیں۔ ان کا اظہار عوامی بھی ہے اور خاص خاصان بھی ہے۔ مجروح اپنی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ بن گئے تھے۔ وہ فلمی گیت کار نہیں بھی ہوتے تو ان کی شہرت کا چاند چمکتا رہتا۔ ان کے بعض شعروں کی گونج گلی کوچوں کے علاوہ اونچی عمارتوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ لبوں پر ان کے اشعار مچلتے رہتے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان اور جدید حسیت سے پیر و جواں سب متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے کچھ شعر جو دنیائے ادب میں ابدی ہوچکے ہیں، ان کی تازگی و خوب صورتی کا کوئی جواب نہیں۔ انھیں سن کر دل و دماغ جھومنے لگتے ہیں:

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہِ صبح گاہی بھی

اس شعر میں تصوف کی پرچھائیں متحرک رہی ہے:

ہم ہیں کعبہ ہم ہیں بت خانہ ہمیں ہیں کائنات
ہوسکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجیے

مجروح کے مزاج میں رومانیت تھی۔ ان کی تخلیقات میں دل دھڑکتا ہے، روح وجد کرتی ہے، ذہن پر بے خودی چھا جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی آدمی اپنے گرد و پیش سے ماورا ہوجاتا ہے:

حادثے اور بھی گزرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے اب مری تصویر نہ دیکھ

مجھے نہیں کسی اسلوبِ شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں ہے

اچھے اچھے دل آویز شعروں کا نزول مجروح سلطان پوری ہی کے ہاں ممکن ہے۔ یہ کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نہیں۔ رگ و ریشے میں نشہ سا دوڑنے لگتا ہے۔ پل بھر کے لیے غمِ دوراں کی سانس رک جاتی ہے۔ قاری احساسات کی جنت میں گم ہوجاتا ہے۔ مجروح کے شعر طلسمی دنیا بن جاتے ہیں۔ یہ اعجازِ شاعری نہیں تو اور کیا ہے۔ نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ان کے شعری پیکروں میں وہی جان ہے جو پہلے تھی۔ مجروح کی اعلا و ارفع شاعری شعر و سخن کا لازوال خزانہ ہے۔ یہ تخت و تاج سے بھی زیادہ قیمتی اور نایاب ہے۔ جب تک اردو کی بستیاں ہیں ان کی شاعری انگڑائیاں لیتی رہے گی۔ وہ کوئی شہابِ ثاقب نہیں جو فلک سے ٹوٹ کر جل بجھ گیا۔ وہ آفتاب و مہتاب کی طرح جگمگاتی رہے گی۔ مجروح کی شاعری کا جادو اس کے جمالیاتی حسن میں مضمر ہے۔ مبالغہ آرائی کہیں نہیں ملتی۔ ان کا محبوب غیر مرئی نہیں وہ جیتا جاگتا حسین و جمیل فرد ہے جس کی زلفِ گرہ گیر کے وہ اسیر ہیں۔ حقیقت نگاری ان کی شاعری کی پہچان ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مہمل زبان سے کام نہیں لیا۔ تجریدیت سے پہلو تہی کی، اسی لیے ان کے اشعار مجذوب کی بڑ نہیں لگتے۔ ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ سامنے نہیں آتا۔ انھوں نے اجنبی و غیر مانوس تراکیب سے اجتناب کیا۔ کہیں بھی زبان کو توڑنے مروڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے ہاں روزمرہ کو احتیاط سے برتا گیا۔ غزل کی غنائیت اور اس کے ظاہری و باطنی پیرہن کو سنبھال کے رکھا، کہیں اس پر جھول یا شکن پڑنے نہیں دی۔ ہر دور میں انھوں نے غزل کو مسموم ہواؤں سے بچائے رکھا۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں بھی غزل کی آن بان، کج دھج پر آنچ نہ آنے دی۔ مجروح کا ایک اور بڑا کارنامہ فلمی پردۂ سیمیں پر معیاری، اور ادبی نغموں کی پیش کشی تھی۔ انھوں نے وہاں بھی غزل کا بھرم باقی رکھا، ان کے نغمے ہند و پاک کے دیوان خانوں، میکدوں، دانش گاہوں اور رہ گزاروں میں اپنی مستی لٹاتے رہے۔ لوگ ان پر پہروں سر دھنتے رہے۔ انھوں نے اپنے لکھے ہوئے پر کوئی مفاہمت نہیں کی۔ یہی روش تادمِ زیست باقی رہی۔ مجروح کا کلام ہمیشہ دلوں کو گرماتا رہے گا۔ وہ اردو والوں کے حافظے میں زندہ رہیں گے۔ میخانے میں تو جام سے جام ٹکراتے ہیں۔ مجروح کی شاعری میں دل سے دل ملتے ہیں۔ اسی سے زندگی کا کارواں نئی منزلوں کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ راہوں کی مٹی بھی سونا ہوجاتی ہے۔ کانٹے گلاب بن جاتے ہیں۔

⊙⊙⊙

مجروح کا ایک اور بڑا کارنامہ فلمی پردۂ سیمیں پر معیاری، اور ادبی نغموں کی پیش کشی تھی۔ انھوں نے وہاں بھی غزل کا بھرم باقی رکھا، ان کے نغمے ہند و پاک کے دیوان خانوں، میکدوں، دانش گاہوں اور رہ گزاروں میں اپنی مستی لٹاتے رہے۔ لوگ ان پر پہروں سر دھنتے رہے۔ انھوں نے اپنے لکھے ہوئے پر کوئی مفاہمت نہیں کی۔ یہی روش تادمِ زیست باقی رہی۔

اردو دُنیا

یو پی ایس سی سے عربی و فارسی زبانوں کے نکالے جانے کی مخالفت

نئی دہلی (۲۰ر جولائی)۔ آج آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس اور آل انڈیا ایسوسی ایشن آف فارسی ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے عہدیداران کی ایک میٹنگ ممبر پارلیمنٹ مولانا اسرارالحق قاسمی کے ساتھ ہوئی۔ اس میٹنگ میں دونوں ایسوسی ایشنوں کے ذمہ داران نے مولانا قاسمی سے گفتگو کے دوران ان کی توجہ یو پی ایس سی سے عربی و فارسی زبانوں کے نکالے جانے کی طرف مبذول کرائی۔ ان کو بتایا گیا کہ ان دونوں زبانوں کا ہندستان کی تاریخ و تہذیب سے بڑا قریبی رشتہ ہے۔ انھیں فرنچ اور جرمن زبانوں کی طرح غیر ملکی زبانوں کے زمرے میں ہرگز نہیں رکھا جاسکتا، جسے بنیاد بنا کر حکومت نے انھیں یو پی ایس سی سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور ان کے ساتھ سوتیلے پن کا رویہ برت رہی ہے۔ ایک طرف تو حکومت مسلمانوں کو رجھانے کے لیے عربی و فارسی یونیورسٹیاں قائم کررہی ہے جیسے مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی (پٹنہ، بہار) اور خواجہ معین الدین چشتی عربی و فارسی یونیورسٹی (لکھنؤ) وغیرہ اور دوسری طرف مسلمانوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف کو ایک میمورنڈم بھی پیش کیا گیا۔ انھوں نے حکومت کے اس فیصلے پر افسوس ظاہر کیا اور نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ عربی و فارسی دونوں ہی زبانیں ملک کی قدیم کلاسیکی زبانیں ہیں، حکومت یا کوئی اور ادارہ اگر انھیں غیر ملکی زبان شمار کرتا ہے تو اسے اس کا ثبوت پیش کرنا ہوگا، محض غیر ملکی زبان کا لیبل لگا کر انھیں یو پی ایس سی سے ہرگز نکالا نہیں جاسکتا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ ۵ راگست سے شروع ہورہے پارلیمانی سیشن کے دوران وہ اس مسئلے کو اٹھائیں گے اور دیگر ممبران پارلیمنٹ کی حمایت بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ حکومت سے اس فیصلے کو واپس لینے کی پُرزور اپیل کی جاسکے۔ اس وفد کے ممبران میں پروفیسر شریف الحسین قاسمی (سابق صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر محمد نعمان خاں (صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر سید حسنین اختر، ڈاکٹر فوزان احمد، ڈاکٹر نعیم الحسن اثری اور مفتی عبیداللہ قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ (انقلاب۔ دہلی)

ہر سال اردو میڈیم کے 10 اسکولوں کو سائنس اور کامرس کی منظوری؟
سرکاری پالیسی پر عمل درآمد بند ہونے سے اردو داں طبقے کو نقصان

کلکتہ (۳ر جولائی)۔ مغربی بنگال میں اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں سے ہر سال دس اسکولوں کو سائنس اور کامرس کی منظوری دی جائے گی۔ سابق وزیر اعلا بدھادیب نے آل بنگال اردو اسکول ایسوسی ایشن کے وفد کو گزشتہ جون ۲۰۱۰ میں اس کی یقین دہانی کرائی تھی۔ اس کی معلومات تنظیم کے سکریٹری اسلم علی نے دی۔ اس کے بعد آج تین سال کا عرصہ گزر گیا، مگر سرکاری وعدہ سرکار کی طرح بے وفا نکلا۔ اس درمیان سیکڑوں ہائی اسکولوں کو ہائر سکنڈری کا درجہ دیا گیا مگر اردو والوں کے حصے میں اب تک آٹے میں نمک کے برابر بھی کچھ نہ آیا جب کہ سائنس شعبے کی منظوری دو چار اسکولوں کو دی گئی ہے لیکن کامرس سے یکسر محرومی ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ گزشتہ تین برسوں میں اگر منظوری دی گئی ہوتی تو سائنس اور کامرس اسٹریم والے درس گاہوں کی تعداد 30 ہوتی۔ آج بھی ہگلی اور ہوڑہ ضلع کے اردو میڈیم اسکول کامرس شعبے سے محروم ہیں جب کہ ہوڑہ ضلع کے ایک ہائی اسکول کو امسال سائنس کی منظوری ملی لیکن اساتذہ کی کمی کے سبب ہائی مدرسہ میں ہائر سکنڈری کی درس و تدریس میں رخنہ پڑ رہا ہے۔ ہاسپیڑیا ای ایم ہائی مدرسہ کو سائنس کی منظوری گزشتہ سال دی گئی، وہاں بھی یہی حال ہے۔ ہگلی ضلع کے دیگر اسکولوں میں رشڑا کے ایک ہائی اسکول کو سائنس کی منظوری فی الحال ملی ہے جب کہ فیض احمد فیض ہائی اسکول تیلنی پاڑہ کو صرف آرٹس کی منظوری ملی ہے۔ پورے ضلع میں کامرس کا شعبہ نہیں ہے۔ دوسری جانب چندن نگر کے ہائی اسکول کو اب تک ہائر سکنڈری کی منظوری نہیں ملی ہے۔ شمالی چوبیس پرگنہ کا اکلوتا اردو میڈیم کانکی نارہ گرلس ہائی اسکول جسے آرٹس اور سائنس کے ساتھ منظوری ۲۰۱۰ میں ملی تھی مگر مضمونوں کی کمی کے سبب وہاں کی ہیڈ مسٹریس شمیمہ خاتون تدریسی پریشانیوں سے دوچار ہیں کیوں کہ وہاں طالبات کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں انھوں نے اب تک سائنس شعبے میں داخلہ نہیں لیا ہے۔ اسی طرح دیگر اضلاع کا حال ہے۔ ایسے میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ وہ حکومت سے سفارش کرکے اردو اسکولوں کو بھی سائنس اور کامرس شعبے سے مزین کرانے میں اہم کردار ادا کرے۔ (اخبار مشرق۔ کلکتہ)

اردو کی تدریس کے لیے ضروری اقدام کرنے وزیر اعلا سے نمائندگی

چینائی (۲۳ر جولائی)۔ تامل ناڈو فیڈریشن آف اردو ایسوسی ایشن کے کنوینر جناب سید سجاد بخاری نے چیف منسٹر ٹاملناڈو کے نام ایک خط لکھ کر یہ خواہش کی ہے کہ اردو اقلیتی عوام کے بچوں کے لیے مدرسوں میں ان کی مادری زبان اردو پڑھانے کے لیے اقدام کریں۔ کالجوں کے موجودہ تعلیمی نظام کا جو فارمولہ ہے وہی فارمولہ مدرسوں میں بھی رائج کردیا جائے تو اردو بولنے والے اقلیتی طلبہ کو اپنی مادری زبان سیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ انھوں نے کہا ہے کہ گزشتہ حکومت نے لسانی اقلیتی عوام کا حق چھین لیا تھا جسے آپ ہی واپس دلاسکتی ہیں اور آپ ہی سے ہم امید کرتے ہیں کہ آپ کا ممتا سے لبریز دل اقلیتی عوام کے لسانی حقوق کا محافظ بنے گا۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

سید شہاب الدین صاحب کا
انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی کے نام ایک خط

تحریک اتحاد بین المسلمین کی اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے کی تحریک سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا

عزیزی اطہر!

کل ہند تحریک اتحاد بین المسلمین نے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اردو کی ترقی کے مفاد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی روزمرہ کی زندگی میں اردو زبان کا استعمال کریں۔ میں اس اپیل سے اتفاق نہیں کرتا کیوں کہ اردو صرف مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے۔

میرا مشورہ ہے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) اسی طرح کا ایک ایسا بیان جاری کرے جس میں تمام اردو بولنے والوں اور اردو سے محبت کرنے والوں سے اپیل کی جائے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اردو کا استعمال کریں، خاص طور سے اپنے نیم پلیٹ، سائن بورڈ اور وزیٹنگ کارڈ وغیرہ میں اردو کا استعمال کریں۔

آپ کا مخلص
سید شہاب الدین
۱۹ر جولائی ۲۰۱۳

اردو میڈیم اسکولوں میں درسی کتابوں کی فراہمی میں تاخیر

حیدرآباد (۱۷ر جولائی)۔ آندھرا پردیش کے اردو میڈیم سرکاری اسکولوں میں درسی کتابوں کی فراہمی میں ہر سال کی طرح اس سال بھی تاخیر ہورہی ہے۔ ضلع رنگا ریڈی کے 30 منڈلوں میں واقع اردو میڈیم اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ درسی کتابوں کے بغیر ہی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔ محکمہ تعلیم کے عہدیداروں کا کہنا ہے کہ رواں سال چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں جماعت کے نصاب میں تبدیلی کی گئی ہے اس لیے نئی درسی کتابوں کی فراہمی میں تاخیر ہورہی ہے۔ ضلع کے بیشتر طلبہ کو دشواری پیش آرہی ہے۔ جب ضلع رنگا ریڈی کے مختلف اسکولوں کا جائزہ لیا گیا تو صنعت نگر کے علاقے اشوک کالونی میں واقع گورنمنٹ ہائی اسکول بہلول خاں گوڑہ کی صدر معلمہ شہناز پروین کے مطابق نویں جماعت کے طلبہ کو انگریزی، ریاضی، فزکس اور سماجی علوم کی کتابیں تاحال فراہم نہیں کی گئی ہیں جب کہ آٹھویں جماعت کے طلبہ کو بھی اردو، انگریزی، ریاضی اور سماجی علوم کی درسی کتابیں اب تک دستیاب نہیں ہو پائی ہیں، جب کہ ساتویں اور چھٹی جماعت کے طلبہ کو اب بھی اردو، ریاضی اور سماجی علوم کی درسی کتابیں نہیں مل پائی ہیں۔ صدر معلمہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ جاریہ سال سے تعلیمی نصاب میں تبدیلی کی گئی ہے اس لیے طلبہ کو قدیم کتابوں سے بھی تعلیم نہیں دی جاسکتی ہے۔ درسی کتابوں کی عدم فراہمی سے طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ شہناز پروین کا کہنا ہے کہ تعلیمی سال کے آغاز کے ساتھ ہی درسی کتابیں فراہم کرکے طلبہ کے مستقبل کو درخشاں بنایا جاسکتا ہے۔ بالانگر کے منڈل ایجوکیشن آفیسر مسٹر ایم ای او Varakumari کا کہنا ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنانے کے اقدام کیے جارہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ نصاب میں تبدیلی کی وجہ سے کتابوں کی تیاری اور فراہمی میں تاخیر ہورہی ہے۔ کتابوں کی فراہمی میں تاخیر پر جہاں طلبہ میں ناراضگی پائی جارہی ہے وہیں دوسری جانب اردو میڈیم اسکولوں میں کتابوں کی عدم فراہمی پر اردو داں حضرات تشویش کا اظہار کررہے ہیں۔ اردو داں حضرات کا کہنا ہے کہ حکومت نے صرف زبانی جمع خرچ کے لیے اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے، لیکن عملی طور پر حکومت اردو زبان کو اس کا جائز حق دینے سے گریز کررہی ہے۔ ضلع رنگا ریڈی کے 30 منڈلوں کے تمام اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کو اب تک چند ہی درسی کتابیں دستیاب ہو پائی ہیں۔ اردو داں حضرات نے حکومت سے اپیل کی ہے کہ اردو میڈیم طلبہ کے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے فوراً جلد اردو میڈیم اسکولوں میں درسی کتابیں فراہم کی جائیں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

تشکیل تلنگانہ کے بعد اردو کو سرکاری زبان کا درجہ

حیدرآباد (۱۰ رجولائی)۔ قائد ٹی آر ایس کے۔ وینکٹیشور ریڈی نے کہا کہ علاحدہ تلنگانہ ریاست قائم ہونے کے بعد تلنگانہ کے تمام اضلاع میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا۔ تلنگانہ حکومت کے تمام سرکاری اعلامیہ تلگو، اردو اور انگلش زبان میں شائع کیے جائیں گے تاکہ تلنگانہ کے تلگو، اردو اور انگلش زبان جاننے والوں کو حکومت کی جانب سے جاری کردہ سرکاری اعلامیے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو سکے۔ کے۔ وینکٹیشور ریڈی نے آج اخباری نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تلنگانہ کی حکومت علاقہ تلنگانہ کے تمام اضلاع میں کثیر تعداد میں اردو میڈیم مدارس قائم کرے گی۔ تلنگانہ کی حکومت تلگو میڈیم اور انگلش میڈیم کے مدارس میں اردو جاننے والے اساتذہ کا تقرر کرے گی تاکہ اس کے ذریعے وہ ان مدارس میں تلگو، انگلش کے ساتھ اردو زبان بھی سیکھ سکیں اور اس زبان میں عبور حاصل کر سکیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کے دادا کے وی رنگا ریڈی جن کے نام سے ضلع رنگا ریڈی قائم کیا گیا تھا انھوں نے ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کے دوران علاحدہ تلنگانہ کی جدوجہد میں حصہ لیا تھا، ان کے والد جسٹس مادھو ریڈی جنھوں نے ہمیشہ ملک کی ترقی کے لیے چھوٹی ریاست کی تائید کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ وہ گزشتہ 20 سال سے امریکہ میں مقیم تھے، وہاں ان کا اچھا بزنس ہے۔ انھوں نے صرف تلنگانہ کے غریب عوام کی خدمت کے لیے دو ہفتے قبل ٹی آر ایس میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ صدر ٹی آر ایس کے چندر شیکھر راؤ نے دو ہفتے قبل چیوڑلہ میں جلسہ عام کا انعقاد کر کے انھیں ٹی آر ایس میں شامل کرنے کا اعلان کیا اور انھوں نے پارلیمانی حلقہ چیوڑلہ سے پارٹی کا امیدوار بنانے کا اعلان بھی کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یکم نومبر ۱۹۵۶ کو آندھرا پردیش ریاست کے قیام کے بعد آندھرا کے حکمرانوں نے ایک منصوبہ بند سازش کے ذریعے شہر حیدرآباد میں اردو زبان کے بجائے تلگو کو فروغ دینے کے اقدام کیے تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے جسٹس کونڈا مادھو ریڈی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شہر حیدرآباد اور تلنگانہ کے اضلاع میں مشاعروں کا انعقاد کرتے ہیں۔ وہ شہر حیدرآباد کے باشندے ہیں۔ بچپن سے انھیں اردو زبان سے لگاؤ ہے۔ پریس کانفرنس میں نائب صدر ٹی آر ایس اقلیتی سیل محمد صالح بھی موجود تھے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

سرکاری دفتروں اور ریلوے اسٹیشنوں پر اردو ناموں میں
املے کی غلطیوں پر اظہارِ افسوس

حیدرآباد (۱۵ رجولائی)۔ سماجی کارکن صمد بن صدیقی نے سرکاری دفاتر اور ریلوے اسٹیشنوں پر اردو ناموں میں غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا کہ فلک نما ریلوے اسٹیشن کے نام میں نون غنہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سکریٹریٹ، حج ہاؤس، شہر و اضلاع کی مساجد، ہوٹلوں، دکانوں، دینی اجتماعات کے پمفلٹس اور وال پوسٹرس، شادی خانوں کے سائن بورڈ اس پر اردو املے کی غلطیاں جا بجا موجود ہیں۔ انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ قابل افراد سے پروف ریڈنگ نہیں کروائی جارہی ہے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

حیدرآباد کرناٹک اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ

گلبرگہ (۳ رجولائی)۔ فعال سماجی کارکن جناب محمد غلام رسول نے وزیر اعلا سدرامیا کو ایک فیکس بھیج کر مطالبہ کیا کہ ریاست میں خاص طور پر حیدرآباد کرناٹک کے اضلاع میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے اقدام عمل میں لا کر اردو زبان کے ساتھ انصاف کریں۔ انھوں نے کہا کہ اسمبلی انتخابات سے قبل کانگریس پارٹی کے زیر اہتمام ریاست کے کئی اضلاع بشمول گلبرگہ میں اقلیتی کنونشن کے انعقاد کے موقعے پر مسلمانوں کے مسائل کی یکسوئی کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو ترقی و فروغ دینے کا بھروسہ دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں علاقہ حیدرآباد کرناٹک میں ۱۹۴۸ تک اردو زبان سرکاری زبان تھی، اس علاقے میں اردو داں آبادی بہت بڑی تعداد میں آباد ہے لہٰذا انھوں نے وزیر اعلا سدرامیا سے اپیل کی ہے کہ وہ علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے اضلاع میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے اقدام عمل میں لا کر لاکھوں اردو داں عوام کے دیرینہ مطالبے کی یکسوئی کریں۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

پرائیویٹ اور مشنریز اسکولوں میں اردو کی تعلیم کو یقینی بنانے کے اقدام

حیدرآباد (۲۳ رجولائی)۔ ریاستی حکومت اردو زبان کے فروغ کے لیے پرائیویٹ اور مشنریز اسکولوں میں دوسری زبان کے طور پر اردو کی تعلیم کو یقینی بنانے کے اقدام کرے گی۔ جن طلبہ کی مادری زبان اردو ہے انھیں پرائیویٹ اسکولوں میں یہ سہولت فراہم کی جائے گی کہ وہ سیکنڈ لینگویج کے طور پر اردو بطور مضمون حاصل کریں اور اسکول انتظامیہ ایسے طلبہ کے لیے اردو کلاسس منعقد کرے گا۔ سکریٹری اقلیتی بہبود جناب احمد ندیم نے آج اردو اکیڈیمی کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن سے بات چیت کریں گے اور انگلش میڈیم مدارس میں اردو بحیثیت سیکنڈ لینگویج تعلیم کو یقینی بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ سابق میں حکومت کی جانب سے اس طرح کی کوشش کی گئی تھی لیکن پرائیویٹ اسکولوں کے عدم تعاون کے باعث یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکی۔ جناب احمد ندیم نے اردو اکیڈیمی پر زور دیا کہ وہ اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے ساتھ ساتھ اردو میڈیم مدارس میں طلبہ کی تعداد میں اضافے کے لیے کوئی منصوبہ تیار کرے۔ اس منصوبے کے تحت اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو مختلف رعایتیں فراہم کی جائیں گی تاکہ وہ اردو میڈیم میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ جناب احمد ندیم نے اردو اکیڈیمی کی کارکردگی اور گزشتہ ایک سال میں تمام جاری اسکیموں پر عمل آوری پر اطمینان کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اکیڈیمی نے بجٹ کی کمی کے باوجود اسکیموں پر موثر انداز میں عمل آوری کی ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم اسکولوں کو یوپی مادھیمک شکشا پریشد سے منظوری دی جائے
سیکنڈری درجے تک ہندی کے ساتھ 30 نمبر کا ابتدائی اردو مضمون نصاب تعلیم میں شامل ہو

دیوریا (۱۸ رجولائی)۔ اترپردیش میں اردو میڈیم اسکولوں کی ضرورت، مسائل اور ان کا ازالہ' موضوع پر یہاں ہونے والے ایک سیمینار میں مقررین نے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس کی ضمانت دستور ہند میں دی گئی ہے اور حق تعلیم قانون (آر ٹی ای) میں بھی اس کی ضرورت بتائی گئی ہے لہٰذا پرائمری، جونیئر ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ سطح پر اردو میڈیم کے اسکول و کالج قائم کرنا ریاستی حکومت پر لازم ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں کو یوپی مادھیمک شکشا پریشد سے منظوری دینے کا قانون بنایا جائے اور سیکنڈری سطح تک ہندی کے ساتھ 30 نمبر کا ابتدائی اردو مضمون نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے۔ مقررین نے کہا کہ سماجوادی پارٹی نے اسمبلی انتخابات سے قبل وعدہ کیا تھا کہ ریاست میں اردو بولنے والوں کی ضرورت کے مطابق اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول قائم کیے جائیں گے مگر حکومت تشکیل ہونے کے بعد اس پر مکمل خاموشی ہے جو باعث تکلیف ہے۔ مقررین نے اردو کو ہندوستانی تہذیب، ثقافت اور تاریخ کا ایک اہم جزو قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی سرزمین پر جنم لینے والی اس زبان کو کسی مذہب سے جوڑنا ناانصافی ہے اور یہ لاعلمی کا بھی ثبوت ہے۔ سیمینار کا انعقاد سائنٹفک ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی دیوریا نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے کیا۔ نظامت کے فرائض شفیق الرحمن نے انجام دیے۔

انجمن اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول، مالویہ روڈ، دیوریا میں منعقد ہونے والے اس سیمینار میں ہر مذہب و طبقے سے تعلق رکھنے والے محبان اردو موجود تھے۔ صدر جلسہ اور ایس ڈی ایس انٹر ڈگری کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین خاں وارثی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی خاطر خواہ تعداد موجود ہے وہاں حکومت کو انٹرمیڈیٹ تک اردو میڈیم کے اسکول قائم کرنے چاہییں اور سائنس و ریاضی سمیت سبھی علوم کی تعلیم اردو میں دینے کا بندوبست کرنا چاہیے کیوں کہ مادری زبان میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا حصول ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔

مہمان خصوصی اور سینئر صحافی قطب اللہ نے اردو زبان کے تحفظ اور فروغ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ دیوریا کی سرزمین بہت زرخیز ہے اور یہاں سے کئی کامیاب تحریکیں اٹھی ہیں، دینی تعلیمی مکاتب کے قیام کی تحریک میں قاضی عدیل عباسی کا ساتھ یہاں کی کئی شخصیات نے دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ قومی یکجہتی میں اردو نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے، جنگ آزادی میں اس زبان نے عوام کو بیدار کرنے کا کام انجام دیا، اس لیے اس زبان کی ترویج ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند ہوں یا پروفیسر گوپی چند نارنگ یا فراق گورکھپوری وغیرہ ان سب نے اردو کے دامن کو موتیوں سے بھرا ہے، عالمی پیمانے کا ادب اردو میں موجود ہے جو پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ اردو اپنے گھر میں بیگانہ نہ رہے اس کے لیے پوری قوت کے ساتھ تحریک چلائے جانے کی ضرورت ہے۔

'انقلاب' کے بیورو چیف فضل الرحمن نے کہا کہ اردو کے سلسلے میں جہاں اترپردیش میں قائم ہونے والی مختلف حکومتوں اور بیوروکریسی نے تعصب کا مظاہرہ کیا تو وہیں اہل اردو نے بھی مواقع کا بھرپور استعمال کرنے میں کوتاہی برتی ہے۔

سیمینار کے کنوینر ظہیر الباری نے مہمانوں اور حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں کا قیام وقت کی ضرورت ہے، حکومت اترپردیش کو اس پر توجہ دینی چاہیے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے حکومت سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ سیکنڈری درجات تک ہندی کے ساتھ 30 نمبر کا ابتدائی اردو مضمون نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یوپی مادھیمک شکشا پریشد سے اردو میڈیم اسکولوں کو منظوری دی جائے، اس سلسلے میں قانون میں ترمیم کی فوری ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اترپردیش میں اردو کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی تب ہوئی جب اردو میڈیم اسکولوں کو ہندی میڈیم میں تبدیل کر دیا گیا اور اردو میڈیم

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اک دیا اور بجھا

حیدرآباد۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، محقق اور ماہر دکنیات پروفیسر عبدالرزاق فاروقی کا ۱۵ ارجون ۲۰۱۳ کو ان کے مکان واقع مغل پورہ میں گردوں کے عارضے کے باعث انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ مکہ مسجد میں بعد نماز ظہر ادا کی گئی اور تدفین ان کے آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں پروفیسر رخسانہ پروین فاروقی (سابق صدر شعبہ تاریخ گلبرگہ یونیورسٹی) کے علاوہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا محمد شہباز فاروقی شامل ہیں۔ نماز جنازہ میں علمی و ادبی، مذہبی و تعلیمی شخصیتوں سے وابستہ افراد اور صحافیوں کے علاوہ سیکڑوں شاگردوں نے شرکت کی۔ پروفیسر عبدالرزاق فاروقی کئی علمی و ادبی کتابوں کے مصنف تھے، وہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے اہم شاگردوں میں شامل تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : کمان
(شعری کلیات، جلد اول)
مصنف : مظفر حنفی
ترتیب : فیروز مظفر
ضخامت : ۵۰۰ صفحات
قیمت : ۳۳۶ روپے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، اے-۱۷۰۰، گراؤنڈ فلور-۳۰، سبھا پارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی-۹۵
تبصرہ نگار : رشید انجم

مظفر حنفی صاحب ہندو پاک کے ان معدودے چند شعرا میں ہیں جن کی شاعری احساسات کی عصری حسیات سے معمور نازک بیانی سے عبارت ہے۔ غزل جذب و کیف، حالات و معاملات اور بصائر و حقائق کا وہ وسیع تر فن ہے جس پر ماضی بعید سے لے کر موجودہ عہد تک بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور مستقبل قریب میں بھی اس صنف پر لکھا جاتا رہے گا۔

مظفر حنفی صاحب کا موضوع سخن بھی غزل ہے لیکن وہ اتنی ہمہ جہت ذہانت کے پاسبان ہیں کہ انھوں نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب ثابت ہوئے۔ مظفر حنفی صاحب بھی اور غیر دشوار گزار شخصیت کے مالک ہیں اسی لیے ان کی نثری اور شعری تحریروں میں پیچیدگی نہیں ہے۔ صاف ستھری اور فکری ان کی تخلیقات ہر اس قاری کو متوجہ کرتی ہیں جو تھوڑا بہت بھی اردو شعر و ادب کا شعور رکھتا ہے۔

مظفر حنفی ہمارے ان شعرا میں بھی شمار کیے جاتے ہیں جن کے فن شاعری پر تنقید یا تبصرہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کے کلام کے بارے میں تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ مظفر حنفی کی شاعری کتاب زندگی کے اوراق پر انقلابات کی باہمی ترتیب کی بلاخیز تحریک ہے۔ وہ تحریک جس کی مرکزیت انسان کے جذبات، محسوسات، افکار اور اس کی اندرونی کیفیات سے مربوط ہوتی ہے۔ چوں کہ ہماری شاعری بھی انہی اعمال سے اپنی ترتیل صداقت کو داخلی و خارجی مظہر نامہ دیتی رہی ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری بھی انہی اوصاف کی آئینہ دار ہے۔

'کمان' (شعری کلیات) کی ایک سب سے اہم اور واضح خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ترتیب، تدوین اور اشاعت میں ان کے سعادت مند اور ہونہار بیٹے فیروز مظفر کی کاوشیں نمایاں ہیں۔ مظفر حنفی یقیناً خوش نصیب شاعر اور تخلیق کار ہیں جنھیں فطرت ازل نے ایسا فرزند عطا کیا۔ اپنے والد کے تئیں اس سے بہتر نذرانہ پدری کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

'کمان' کا عنوان انسان کے فطری ارتقائی عمل، اس کی زندگی کے ہر شعبۂ تغیر، ہر عہد، ہر زمانے میں تغیرات کا راست اثر انسان کے زاویۂ فکر و نظر نے قبول کیا ہے، تاریخ کو اپنے اندر سموئے اور جذب کیے ہوئے ہے۔ 'کمان' سے نکلا تیر، کہا جاتا ہے کہ پھر واپس نہیں آتا۔ مظفر حنفی صاحب کی شعری اور تخلیقی کمان سے جو تیر نکلے ان تیروں پر مظفر صاحب کے فن، ان کے اسلوب، ان کی قافیہ پیمائی کے اعلا اور متاثر کن نقوش ثبت ہیں جنھیں مٹا دینا ناممکنات میں سے ہے، اس لیے کہ مظفر صاحب نے زبان، عروض اور فن کے قواعد اور اصولوں کی تشکیل و تعمیر پر اپنی عمر صرف کی ہے۔ عصری حسیت اور آگہی کا گہرا مشاہدہ اور زندگی کے بسیط تر پہلو ان کی شاعری میں ابھر کر ہوئے ہیں۔

مظفر حنفی صاحب کی یہ کلیات ان کے تمام شعری تخلیقی فن پاروں کا نقش اوّل ہے۔ یہ کلیات ان کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ اس ضخیم کلیات کا دیباچہ اردو زبان و علم و ادب کے معتبر ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کا تحریر کردہ ہے۔ فاروقی صاحب نے مظفر حنفی کی فکری، مشتقیہ، فلسفیانہ، طنزیہ اور مضمون آفرینی شاعری پر مکمل گفتگو کی ہے۔ یہ دیباچہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے اور مطالعے کی دعوت دیتا ہے کہ فاروقی صاحب نے مظفر حنفی کی شاعرانہ عظمت کو بہت احتیاط سے تسلیم کیا ہے۔

'کمان' کو فیروز مظفر نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب 'تیکھی غزلیں' کے زیر عنوان ہے۔ ۷۰ صفحات پر مشتمل اس باب میں ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۳ تک یعنی چار سال کے عرصے میں کہی گئی غزلوں کو شامل کیا ہے۔ باب دوم کو 'عکس ریز' کا عنوان دیا گیا ہے۔ 'عکس ریز' میں ۴۳ صفحات کو طویل نظموں کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ یہ نظمیں مظفر صاحب نے ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۵ تک صرف ایک سال کے عرصے میں کہی تھیں۔ ۱۳۱ سے ۱۹۶ صفحات میں 'صریر خامہ' کے زیر عنوان ۱۹۶۳ سے ۱۹۶۵ تک کہی ہوئی غزلوں کو یکجا کیا گیا۔ ۱۹۷ سے ۲۵۶ صفحات میں 'پانی کی زبان' کے عنوان کے تحت ۱۹۶۶ سے ۱۹۶۷ کے درمیان کہی گئی شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ شاعری غزلیات اور آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ ۲۵۷ سے ۳۸۲ صفحات 'طلسم حرف' کے زیر عنوان ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۱ کی شعری تخلیقات کے لیے مختص کیے گئے ہیں جو غزلیں، آزاد نظمیں اور رباعیات پر مشتمل ہیں۔ ۳۸۳ سے ۳۳۸ تک کے صفحات پر بچوں کی نظمیں اور زمری رائمس اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ یہ شاعری ۱۹۵۲ سے ۲۰۱۲ یعنی ۶۰ طویل سالوں کے عرصے پر محیط ہے جسے بچوں کی مناسبت سے 'کھیل کھیل میں' کا عنوان دیا گیا ہے۔ باقی ۳۳۹ سے ۳۹۵ صفحات پر مظفر صاحب کی وہ شعری تخلیقات شامل کتاب ہیں جو ابھی تک طباعت کے مراحل سے نہیں گزری ہیں۔

اس کلیات کی ترتیب، تدوین، انتخاب کلام اور ان کے موضوعات کے مطابق ان کے عنوان قائم کرنا انتہائی دشوار ترین مرحلہ رہا ہوگا جسے فیروز مظفر نے اپنی دیدہ وری اور عرق ریزی ذہانت سے آسان کر دیا۔ اس کلیات 'کمان' کا کلام بوئے گل کے سرگیں خمار کی مانند قاری ہی نہیں اہل دانش کے حواس پر بھی وارد ہوتا ہے۔ مظفر حنفی صاحب جو بھی موضوع منتخب کرتے ہیں (خواہ وہ غزل ہو، پابند یا آزاد نظم ہو) ترتیب و ترغیب کے باہم عمل کا باہمی اظہار ہوتا ہے۔ بچوں پر کہی گئی ان کی موضوعاتی نظمیں بچپنا کے کھلونوں سے کھیلتی معصوم شگفتہ انجمیں ہیں تو طنز و ظرافت میں ڈوبی نظمیں جلتی سلگتی ذاتی وارداتوں کا عکس مکمل ہیں۔ مظفر حنفی صاحب نبض شناس بھی ہیں اور نکتہ شناس بھی۔ ہر گزرتے وقت کی چاپ کو ان کے پیروں نے روندا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کا وجود روحانیات و شعریات سے منتقی عملی توثیق اور شفاف بشری پیکر کا مظاہر ہے۔ یہی وہ فیض ہیں جن کے زیر سایہ رہ کر مظفر حنفی صاحب نے اخلاقی درس بھی حاصل کیا اور اصلاحی تدریس سے خود کو باوصف بھی کیا ہے۔ ان کی شاعری کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ مظفر حنفی صاحب اقبال کے اثبات خودی کے تصور اور غالب کی شعری جمالیات سے متاثر رہے ہیں مگر ان کی فکری اساس ان سے مغلوب نہیں ہوتی۔ مظفر حنفی صاحب نے انسان کی عظمت کو شاعری کی اساسی فکر ضرور دی ہے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ فلسفہ اور نفسیاتی عمل ان کے کلام میں ایک کردار کی مانند وارد ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں انسان اپنی جملہ الیاتی و جزئیاتی اور حرکت و عمل کی ترتیبی مصالحت سے جلوہ گر ہوا ہے۔ ان کے تمام تر شعری منظر نامے کا یہ بنیادی وصف ہے اور اسی بنیادی وصف پر مظفر حنفی صاحب اپنے پورے شعری قصر کو تعمیر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سادہ سی پرکاری ہے جو بہت سلاست روی سے قاری کے ذہن کو اپنے زیر اثر لے لیتی ہے۔ میں نے یہاں ان کے نمونۂ کلام کو پیش کرنے سے گریز کیا ہے، اس لیے کہ تخلیقیت اور شخصیت کا عمل ان کے کلام سے اتنا مربوط ہے کہ انتخاب ہو تو کیسے؟ اس لیے گریز ہی بہتر ہے۔

'کمان' (شعری کلیات) کا یہ حصۂ اوّل ہے، یقیناً حصۂ دوم بھی زیر ترتیب و تدوین ہوگا اور جلد ہی منظر نگاہ کو جلوہ گر کرے گا۔

'کمان' میں جہاں کلام کے انتخاب اور تدوین میں عرق ریز صلاحیت کا اظہار واضح ہے وہیں عرشیہ پبلی کیشن نئی دہلی نے اس کی اشاعت اور طباعت میں فنکارانہ عکاسی کو ملحوظ رکھا ہے۔ کاغذ معیاری اور دبیز استعمال ہوا ہے جس کی سطح پر ہر سطر ابھر کر طباعت کی فنی خوبیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ خوب صورت طباعت اور ٹیک ٹائٹل پر مظفر حنفی صاحب کی تصویر کے عکس کو جس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ ○○

نام کتاب : پیکر اور پرچھائیاں
مصنف : محمد اسد اللہ
ضخامت : ۲۱۲ صفحات
قیمت : ۱۰۳ روپے
ملنے کا پتہ : 30 گلستاں کالونی نزد پانی کے امراوتی لائنس جعفر نگر، ناگپور 440013
تبصرہ نگار : سعید اختر اعظمی

وجود کا عکس اور جہتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ جب پیکر کی پرچھائیں مختلف ہو سکتی ہے تو زاویۂ نظر کیوں نہیں۔ فنکار اور محقق نئی سمتوں اور تخیلات تک رسائی چاہتا ہے۔ محمد اسد اللہ نے بھی متنوع موضوعات پر غور و خوض کر کے انھیں سپرد خامہ کیا ہے۔ 'پیکر اور پرچھائیاں' میں عناوین کا تنوع بھلے زیادہ نہ ہو مگر علاقائی ادب کا جائزہ لینے کی کوشش کافی حد تک کامیاب نظر آتی ہے۔ مہاراشٹر اور ودربھ کے طنز و مزاح، فکشن اور شاعری میں جدید رجحانات کی تلاش بھی کارگر رہی ہے۔

'پیکر اور پرچھائیاں' میں 'تعریف انشائیہ' اور 'انشائیہ آزادی کے بعد' کے تحت قدیم و جدید انشائیہ نگاروں کے نظریات کو پیش کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ ذہن کی آزاد ترنگ ہے۔ اس میں گریز کی کیفیت ہوتی ہے۔ اردو میں ملا وجہی اور سرسید کو اس کا باوا آدم مانا جا سکتا ہے۔ محمد حسین آزاد، احمد جمال پاشا اور رام لعل نابھوی سے لے کر انور سدید اور وزیر آغا وغیرہ تک ایک طویل سلسلہ ہے جنھوں نے اس صنف کو قائم و دائم رکھا ہے۔ 'مہاراشٹر میں طنز و مزاح' اور 'مراٹھی ادب میں طنز و مزاح' کرشن چندر سے انصاری اصغر جمیل تک اور شری کرشن کو لیکر سے جیونت دلوی تک کے سفر کا جائزہ لیا گیا ہے تو 'ودربھ میں مزاح نگاری' اور 'ناگپور میں ظرافت' علاقہ ہذا میں اس حوالے سے ترسیل و ترویج کا عمیق مطالعہ ہے۔ ودربھ میں اردو افسانے کا آغاز و ارتقا بتلاتا ہے کہ عبدالستار فاروقی نے 1931 میں کامٹی سے اپنا ہفت روزہ 'امید' نکال کر افسانوی طرز اظہار کو فروغ دیا جسے دیگر فکشن نگاروں نے تاحال برقرار رکھا ہے۔ 'مراٹھی اور اردو شاعری میں جدید رجحانات' بال سیتارام مرڈھیکر اور ن م راشد وغیرہ کی کے رہنما خطوط کی نشان دہی ہے تو 'تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ' غالب سے مجاز تک انقلاب حریت کا جزو بننے والوں کا اجمالی خاکہ سامنے لاتا ہے۔ 'شاعری کی تدریس اور ہمارے تعلیمی ادارے' تعلیم گاہوں کے اساتذہ کو آئینہ دکھاتا ہے کہ وہ نئی نسل کی صحیح تربیت کیوں نہیں کر پا رہے ہیں۔ 'اقبال کا داعیانہ اسلوب' ان کی دروں بینی کا اظہار ہے تو 'سعادت حسن منٹو کی کردار نگاری' سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اپنی بشری کمزوریوں کے باوجود فطری سادگی سے دل کو چھو لیتے ہیں۔ 'نگلی ڈنڈا ایک تجزیہ' میں یہ بتایا گیا ہے کہ پریم چند کا یہ افسانہ انسانی نفسیات کے نازک گوشوں کی عکاسی خوب صورت انداز میں کرتا ہے۔ 'مراٹھی ادیب سانے گروجی'، 'ظرف قریشی'، 'ناظم انصاری'، 'خورشید آرا بیگم' اور 'س یونس الکشاف کے آئینہ میں' متنوع جہات شخصیات کے فکر و فن پر طائرانہ نگاہ قاری کو ان کی تخلیقی کاوشوں سے آگاہ کراتی ہے۔

محمد اسد اللہ کے یہ مضامین علاقائی ادب کے وسیع تناظر کو سامنے لانے کے ساتھ تحقیقی روش پر مزید آگے بڑھنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

○○○

بقیہ: زبان و بیان کے بعض پہلو

صفحہ ۲ سے آگے

ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاں نہ قاعدے کے لحاظ سے بات درست ہو، نہ مذاقِ سلیم کے نقطۂ نظر سے، وہاں کیا رنگ ہوگا؟ آج کل تفرقی آواز، چنچلا خیال، سکوت بسیط جیسی ترکیبیں بعض شاعروں کے یہاں کثرت سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بہت سے دو نارسیدہ شاعر محض تقلید کی برکت حاصل کرنے کے لیے ان کو فراخ دلی سے استعمال کرتے ہیں جن کو صحتِ کلام و تناسبِ بیان کا احساس و رکنار، ان مرکب استعاروں کے صحیح معنی بھی نہیں معلوم ہوتے۔

یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ جدتِ بیان اور ندرتِ تعبیر اس وقت تک پیدا نہیں کی جاسکتی جب تک کہ حسنِ بیان، صحتِ بیان اور مانوس طرزِ بیان سے چھٹکارا نہ حاصل کیا جائے۔ نئے شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے مقامات پر ان لوگوں نے جدتِ تشبیہ یا ندرتِ تعبیر کی بہترین مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ان تشبیہوں اور استعاروں کو دیکھ کر ہر شخص تعریف کرنے پر مجبور ہوگا۔ میں سردار جعفری کے یہاں سے ایسے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں:

پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پر سکھاتی ہے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جنگل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہوجائے

ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح

غبار شام شفق کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے

افق کے کوہسار میں شفق کے آبشار ہیں

یہ پیڑوں کی گردن میں پھولوں کے ہار

رنگتی ہیں تارنجیں
روز و شب کی راہوں پر

نوجوان جسموں پر
پیرہن ہیں رنگوں کے

ان کے ہاتھ میں جیسے
گیت گانے لگتے ہیں
جھوم جھوم کر پودے
اپنا سر جھکاتے ہیں

رات پینگ لیتی ہے
چاندنی کے جھولے میں

راتقل کرتی ہے قوالوں کے ہونٹوں سے کلام

اور وہ بوڑھے جہاں دیدہ رفیق
مخبریاں جن کی ہیں تاریخِ حوادث کے ورق

اس حسنِ بیان کی داد کون نہیں دے گا؟ لیکن جب وہ دل ہوئے، پھانسیاں اگانے اور آواز کو گھونٹنے کا کاروبار شروع کرتے ہیں، اس وقت یہی نہیں کہ اس حصۂ کلام سے دل کشی قطع تعلق کرلیتی ہے، دوسرے بہت سے نوجوان شاعروں کی کم راہی کا سروسامان بھی فراہم ہوجاتا ہے۔

یہ عرض ہے کہ جدت و ندرت دقتی کے بغیر پیدا ہی نہیں کی جاسکتی، قدیم ادب کے مطالعے سے بے نیاز ہوجانے کا پیدا کردہ ہے۔ صرف میرانیس کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ندرتِ تشبیہ و استعارے کی کیسی عجیب مثالیں بکھری ہوئی ہیں، جن کو پیش نظر رکھ کر ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت علی اکبر میدانِ جنگ میں تشریف لائے ہیں، دہشت سے فوجِ شام پیچھے ہٹ گئی ہے، اس موقعے پر فرماتے ہیں:

دہشت سے فوجِ شام کی بدلی سمت گئی
قدرت خدا کی، دن جو بڑھا رات گھٹ گئی

دوسرے مصرعے میں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے اور استعارہ جس خوبی سے صرف ہوا ہے، وہ داد سے مستغنی ہے۔ حضرت حسینؓ کے ہمراہیوں نے تیمم کیا ہے، چہروں پر ہلکا سا غبار ہے، اس کا بیان دیکھیے:

ع: باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب

ع: مٹی سے آئنوں پہ جلا اور ہوگئی

دو تشبیہیں دیکھیے۔ حضرت عباس نے قطعِ بازو کے بعد مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا ہے، اس عجیب الوضع منظر کی تشبیہ ملاحظہ ہو، حسنِ تشبیہ نے اس بہ ظاہر بدوضع منظر کا رنگ ہی بدل دیا ہے:

ع: مشکیزہ تھا کہ شیر کے منہ میں شکار تھا

شہادتِ حسینؓ کے بعد اہلِ بیت کو اسیر کرلیا گیا ہے، بارہ افراد کو ایک رسی میں باندھا گیا ہے، فرماتے ہیں:

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گل ہائے چمن

مرادف الفاظ میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے، اس لیے یہ ضروری نہیں کہ جو صفت ایک لفظ کے ساتھ آسکتی ہو، وہ دوسرے لفظ کے ساتھ بھی آسکے۔ حسنِ بیان کے نقطۂ نظر سے توصیفی مرکبات میں تناسبِ باہم کی بہت اہمیت ہے۔ جس طرح مرادف الفاظ میں سے مناسب تر لفظ کے انتخاب کا اثر پورے شعر پر پڑتا ہے، اسی طرح مناسب صفت کے استعمال کا حسن کام کر جاتا ہے۔ شاعر کے ذہن میں یہ تفصیلات مرتب نہیں ہیں تو شعر کی خوبی پر حرف آجائے گا۔ یہی صورت مناسب الفاظ کے انتخاب کی ہے۔ ہمارے بہت سے نئے شعرا الفاظ کے انتخاب میں بہت دراز دستی سے کام لیتے ہیں، جس کی وجہ سے اچھا خاصا شعر بے مزہ ہوجاتا ہے۔ چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا:

رقص کرتی ہے ترے حسن کی رعنائی میں
وادیِ نجد کے پھولوں کی نکیلی خوشبو
(قتیل)

حسن کی رعنائی میں خوشبو کے رقص کرنے کو چھوڑیے، یہ دیکھیے کہ خوشبو کی صفت نکیلی کتنی بے جوڑ ہے۔ لفظ نکیلی ایسے موصوف کے لیے آسکے گا جو مادی وجود رکھتا ہو۔

ہاں وہی ہاتھ تڑکتے ہوئے کوڑوں کی طرح
زخم ہر پیٹھ پہ ہر جسم پہ برساتے ہوئے
علم کی طرح شبِ ظلم کی مانند طویل
(سردار جعفری)

ہاتھوں کو تڑکنا کہنا بے سروپا بات ہے۔ یہی حال "تڑکتے ہوئے" کا ہے، جو نہ ہاتھوں کے لیے بہ طور صفت آسکے گا نہ کوڑوں کے لیے۔

ع: گھناونی ہے پُراسرار ہے فضا ساری
(ندیم)

کثرتِ ظلمت کے لیے یہ کہنا کہ فضا گھناونی ہے، بے جوڑ بات ہے۔ گھناونی اظہارِ کراہت کے لیے آتا ہے، نہ کہ اظہارِ کثرت کے لیے۔

ع: چھپی بدلی میں سورج مسکرایا
(ندیم)

"چھپی بدلی" بدمذاقی کا کام یاب ترین مظاہرہ ہے۔

رقص کے ساتھ اگر ساز کی جھنکار نہ ہو
تو اک الجھی ہوئی زنجیر ہے یہ لحنِ سلیم
(ندیم)

لحن کے ساتھ سلیم بہ طور صفت کسی طرح نہیں آسکتا۔ یہ لفظ ذوق، فطرت، طبع جیسے الفاظ کے ساتھ آتا ہے۔

ع: جنبش کی آتش جرار کہاں سے لاؤں
(فیض)

ع: اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے
(سردار جعفری)

ع: نرم گلابی جاڑے گزرے
(جاں نثار اختر)

ع: پھر کوئی نرم سا جب راگ سنا دیتے ہیں
(جذبی)

نرم راگ، آتشِ جرار، سخت خموشی، نرم جاڑے بے جوڑ منافی الفاظ سے مرکب ہیں۔ جرار کو آگ کی صفت بنانا محض بے سروپا بات ہے۔ سخت، بہت کے معنی میں آتا ہے، لیکن اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ وہ ہر جگہ آسکتا ہے۔ نرم راگ سب سے زیادہ معنوی تناسب سے عاری ہے۔

ع: مرمریں تہذیب کی لازم ردا اتنی سمٹ گئی ہیں
(جاں نثار اختر)

ع: کتنے لمبے کہ جیسے نرم سبک آنچل ہے
(جاں نثار اختر)

ع: کمسن سی ملائم راہوں پر بوندوں کی خواہشیں پڑنے لگیں (ساحر)

ملائم راہیں، نرم آنچل، ملائم زلفیں لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعر گویا تو ان الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں معلوم یا وہ مذاقِ سلیم سے محروم ہے۔

ع: ساغرِ خشک ابھی حقۂ وشوار سہی
(مجروح)

ع: ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک آتے ہیں
(فیض)

ع: یہ فلک بوس ملیں دلکش و سیمیں بازار
(ساحر)

ع: جنبشِ ابرو کے کتنے دلکش و نازک سلام
(سلیمان اریب)

ع: دی گھٹا نے منظرِ دہی کو یہ جذام
(سلیمان اریب)

ع: نگل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
(سلیمان اریب)

ساغرِ خشک، ساغرِ ناب، سیمیں بازار، نازک سلام، کریہہ جذام اور مرمریں خواب، سارے مرکبات غیر مناسب منافی الفاظ سے گراں بار ہیں۔

ع: وہ اجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
(ساحر)

ع: کہ زندگی ترے زلفوں کی نرم چھاؤں میں
(ساحر)

ع: ابھرے جو ہے ادب نہ جھکیں گے آنکھڑے
پرچم نہ جھکیں گے (ساحر)

اجلے دریچے، نرم چھاؤں اور آنکھڑے پرچم صحتِ بیان سے معرا ہیں۔ اجلا کپڑے کے قیاس پر اجلا دریچہ لکھنا سلامتِ طبع سے سارے رشتے ختم کرلینا ہے۔ نرم اور نازک ان دو لفظوں کو عام طور سے بے محل استعمال کیا جاتا ہے، نرم چھاؤں بھی اسی ذیل میں ہے۔ آنکھڑا پرچم ان سب سے منتزاد ہے۔ پھر شاعر نے اسی پر بس نہیں کیا ہے، آنکھڑے پرچم کے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ اب نہیں جم سکے گا۔

(باقی آئندہ)

OOO

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

اسکولوں کو منظوری دینا بھی بند کردیا گیا۔ پھر اس کے بعد سہ لسانی فارمولے میں بھی اردو کو نظر انداز کردیا گیا۔

گورکھپور سے آئے قاضی عبدالرحمن نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں، ایک تہذیب کا نام ہے، اس کی حفاظت سب کی ذمہ داری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو کے اساتذہ تعینات کیے جائیں کیوں کہ اساتذہ نہ ہونے کی وجہ سے اور کبھی محکمہ تعلیم کے اہلکاروں کے منفی رویے کی وجہ سے اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ و طالبات کا نقصان ہوتا ہے، اس کی انھوں نے کئی مثالیں پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ جہاں مسائل ہوں تو خاموش ہوکر بیٹھ نہیں جانا چاہیے بلکہ مسائل کے حل کے لیے بیباک گفتگو ادھیکاری سے لے کر دیگر متعلقہ افسروں کو تحریریں دے کر ضرورت کا احساس دلانا چاہیے۔ شاداب اختر فلاحی نے اردو کے فروغ میں مدارس کا رول موضوع پر مقالہ پیش کیا۔

ارشاد احمد کامل نے آزادی سے قبل کی لسانی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ساتھ تعصب کا مظاہرہ کیا گیا، حالاں کہ یہ بھی ایک سچائی ہے کہ اردو سے محبت کرنے والے ہر طبقے اور مذہب کے لوگوں میں موجود ہیں۔ پریم لتا پانڈے نے کہا کہ کسی زبان کی مخالفت کرکے ہم دوسری زبان کی ترقی نہیں کرسکتے، ہر زبان کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ غیر اردو داں لوگ جو اردو زبان کو پڑھنا اور لکھنا سیکھنا چاہتے ہیں ان کی تدریس کا بہتر نظم ہونا چاہیے۔

(انقلاب۔ گورکھپور)

تمل ناڈو کا علمی وادبی سرمایہ

ڈاکٹر جاویدہ حبیب
اردو لیکچرر اکادمی آف اسلامک ریسرچ، ایس آئی ای ٹی کالج کیمپس، چینئی ۔ ۶۰۰۰۱۸

میں سمجھتی ہوں کہ اردو ادب میں سچائیاں پیش کرنے والوں کا روز بہ روز فقدان ہوتا جارہا ہے۔ آج کتابوں پر مقدمے یا تبصرے لکھنے والے جھوٹ تو نہیں لکھتے مگر بے جا تعریفوں کے آسمان روشن کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے تخلیق کار اور اس کی تخلیقات کے نشیب و فراز میں جو معیوب پوشیدہ ہوتے ہیں وہ نمایاں ہونے سے رہ جاتے ہیں۔

ہمارے قدیم ناقدین مثلاً نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر ابو محمد سحر، آل احمد سرور، احتشام حسین، مسعود حسین رضوی اور محمد حسن کے ہاں غزل گو شعرا کے کلام کی کمزوریوں پر نشان دہی بڑی متانت اور سنجیدگی کے دائرے میں ہوتی تھی جس سے شعرا کی دل شکنی یا حوصلہ شکنی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعد کے دور کے ناقدین یعنی حالیہ دور میں گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر صادق اور ڈاکٹر عتیق اللہ کی تنقیدی تحریروں میں بھی یہی وصف نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

اردو غزل کو غزل کی قدیم حدود اور روایتی جہتوں سے باہر نکالنے کی کوشش میں بعض شعرا یقیناً اپنی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ بعض شعرا مثلاً باقی، خورشید احمد جامی، عرفان صدیقی، فضا ابن فیضی، شاذ تمکنت، مظفر حنفی اور زیب غوری نے اردو غزل کو ماضی کے بھنور سے بچاکر مستقبل کی نئی غزل کو وسیع سمندری لہروں پر لہرانے کے فن سے آگاہ کیا ہے۔

تمل ناڈو میں بھی نئی اردو غزل جن باشعور شعرا کے ہاتھوں آکر خوب سے خوب تر ہوئی ہے اُن شعرا میں شاکر نائطی، آسی ترپاتوری، دانش فرازی، کاوش بدری، مختار بدری، راز امتیاز اور علیم صبا نویدی کے نام سر فہرست ہیں۔ اگر اردو رباعی کا ذکر ہوگا تو حالیہ دور میں قدوسی باقوی، پرتو مدراسی، قادر ظہیر اور حسن فیاض کی رباعیاتی چمک دمک یقیناً تمل ناڈو کے اردو جزیرے کی آبرو ثابت ہوگی۔

اردو نظم کے سلسلے بھی تمل ناڈو کی سرزمین میں بڑے طویل اور نمایاں ہیں، قدیم دور میں قربی ویلوری، ذوقی ویلوری، باقر آگاہ، قادری، آشفتہ آرکاٹی، نادر آرکاٹی، غوثی چنگل پیٹی، اسماعیل رئیسی، مرغوب ترچناپلوی، امانی بانکنڈوی اور جدید دور میں عزیز تمنائی، نثار بھارتی اور علیم صبا نویدی نے اردو نظم کی جہتوں کو نہ صرف وسعتیں دیں بلکہ مندرجہ بالا شعرا نے اپنی اپنی مثنویوں، ترائیلے اور سانیٹوں کے ذریعے ان اصناف کو اعلا وقار بخشا ہے۔ مسرت اس بات کی ہے کہ یہ سلسلے ہنوز جاری ہیں اور ان سلسلوں کی روشن کڑی حضرت علیم صبا نویدی ہیں۔

تمل ناڈو میں اردو نثر نگاری بھی بڑے شاندار پیمانے پر ہوئی ہے، بالخصوص مدراس یونیورسٹی میں جن موضوعات پر مقالے لکھے گئے ہیں وہ اس بات کا بین ثبوت دیتے ہیں۔

یونیورسٹی کے ان مقالہ جات سے ہٹ کر ہمارے یہاں کے اکثر قدیم و جدید شعرا حضرات نے اردو نثر نگاری میں بھی اپنا الگ مقام بنایا ہے، ان میں قربی ویلوری، ذوقی ویلوری، محوی ویلوری، باقر آگاہ ویلوری، ایمان کوپاموی، مولانا یوسف کوکن، مولانا فضل اللہ، مولانا عظمت اللہ سرمدی کا اعلا نثر آج بھی مدراس کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہے۔ اردو تنقید، افسانہ نگاری، انشا پردازی اور خاکہ نگاری میں جن ارباب علم و ادب کی تحریروں کے نقوش ہمارے سامنے ہیں ان میں شاکر وانمباڑی، شاکر نائطی، حیدر علی خاں حیدر، نثار گمری، عبدالعزیز عادل، ادیب بھارتی، کاوش بدری، دانش فرازی، راز امتیاز، فرحت کیفی، اعجاز شاکری، ساحل رشید، نورس خیامی اور راہی صدیقی کا نثری سرمایہ تمل ناڈو کے تاریخ ادب کے صفحات میں دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

تمل ناڈو میں اردو افسانہ نگاری کی پرورش اور پرداخت میں قدوسی باقوی، ادیب بھارتی، نورس خیامی، عابد معنی، انور ربانی، راز امتیاز، حسن فیاض، کاظم نائطی، یعقوب اسلم، راہی فدائی اور اکبر زاہد نے بہت اہم ترین رول ادا کیا ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں میں عباسی بیگم (بہ قول علیم صبا نویدی تمل ناڈو کی پہلی افسانہ نگار خاتون ہیں جن کے افسانے ۱۹۲۸ تک ماہنامہ 'تہذیب نسواں' میں شائع ہوتے رہے)، حجاب امتیاز علی تاج (دختر عباسی بیگم)، مہر طلعت آمبوری، امیر النسا، منور رشید، نعیمہ پرویز، عرفانہ تزئین شبنم، فہمیدہ تبسم، عطیہ کوثر، قمر نگار جیلی اور محمدی بیگم نے اپنی فنی اور فکری صلاحیتوں سے جہان اردو افسانہ نگاری کو وقار بخشا۔ یہاں کے بعض افسانہ نگاروں نے ناول نویسی پر بھی خاص توجہ دے کر اپنا مقام و مرتبہ متعین کیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمل ناڈو کی پہلی ناول نویس حجاب امتیاز علی تاج وانمباڑی ہی ہیں جنھوں نے اردو دنیا میں آفاق گیر شہرتیں حاصل کی تھیں۔ حجاب کے انتقال سے پہلے سعادت حسن منٹو نے جو انٹرویو حجاب کے گھر پر لیا تھا وہ حجاب کی علمی و ادبی زندگی کا بھرپور احاطہ کرتا ہے جو 'نقوش' کے خاص نمبر میں جگہ پایا تھا۔ حجاب کے بعد دوسرے ناول نویس اے۔ آر۔ حسینی ہیں جن کا ناول 'نگا ماحول' غالباً ۱۹۵۵ میں منصہ شہود پر آیا تھا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اس ناول کی پذیرائی میں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے ارباب علم و فن نے یقیناً بخالت سے کام لیا ہے۔ اس فن کار کے ذہن و دل میں اردو ادب کو مزید کچھ دینے کی تمنا موجزن تھی مگر وہ ادھوری ہی رہ گئی۔ ابھی گزشتہ ماہ اس فن کار نے وانمباڑی کی سرزمین کی اس خاک سے اپنا ابدی رشتہ جوڑا ہے۔ ۱۹۶۲ میں رشید مدراسی کا ناول 'ہیرو' مشورہ بک ڈپو دہلی سے شائع ہوا تھا، اس ناول کی اشاعت کے لیے رشید نے مشورہ بک ڈپو کی خاص گزارش پر مزید ایک اور ناول اشاعت کے لیے بھجوایا تھا۔ فرستادہ ناول کی اشاعت کا انتظار رشید کو برسوں کرنا پڑا لیکن آج تک وہ ناول اشاعت کی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔ اردو تاجروں سے شکایت بھی ان دنوں فضول ہے۔ محمد جعفر حسین فیضی صدیقی ویلوری کے دو جاسوسی ناول بھی دہلی ہی کے کسی اشاعت گھر نے ۱۹۶۳ میں شائع کیے۔ (مصنف نے یہ اطلاع علیم صبا نویدی کے ایک انٹرویو میں دی تھی اور یہ انٹرویو ڈاکٹر راہی فدائی نے سالنامہ 'صفیر ویلور' میں شائع کیا تھا)۔ نورس خیامی کا ایک ناول 'مرگھٹ کی خوشبو' پاکستان کے ایک اشاعتی ادارے نے ہضم کرکے ڈکار تک نہیں دی۔ ایس۔ ایم۔ حیات اور صبا مصطفیٰ کے ناول پتا نہیں کہاں لاپتا ہوگئے۔ اللہ کا خاص کرم ہے کہ امیر النسا کا ناول 'تتبرین' شائع ہوکر منظر ادب پر آیا مگر وہ بھی گمنامی کی گرد میں کھوگیا۔ منور رشید کا ناول 'خوددار' قسط وار ماہنامہ 'گلفام' دہلی میں شائع ہوا۔ راز امتیاز اور علیم صبا نویدی کے ناول دیمک کی خوراک بن کر رہ گئے۔ ان دنوں ویلور کے وی۔ ایم۔ باشاہ کا ناول اپنی آخری منزل پر ہے، یہ ناول فرید بک ڈپو سے شائع ہونے کی قوی امید ہے۔

•••

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲ ۔ راؤز ایونیو، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax:011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org